

۔ مگر میرے پاس کوئی فالتو دری بھی نہیں ہے۔“

”نگا ذرش تو ہے؟“

”ہاں وہ ہے، اگرچہ وہ بھی اب ادھرنے رکھا ہے۔“

ہم کمرے میں داخل ہوتے۔ ایک جھلک چارپائی، اس پر ایک ملی دلی درنی پچھی ہوتی سر لاتے ایک ضخم کتاب رکھی ہوتی۔ ایک گھونٹرے میں چٹائی پچھی ہوتی، اس پسکتا بین بکھری ہوتی۔“

”سر لانے کی خیم کتاب کوئی نہ اٹھایا؟“ یہ کیا ہے؟“

”یہ کلیاتِ نظر ہے اور میرا تکیہ ہے۔“

”تم ابھی سونے کے لئے بکھرے کے علاج ہو، زوار بولا۔“

”بات یہ ہے کہ بیداری ہو یا خواب میں اپاسراو سچار کھنا چاہتا ہوں۔“

یہ نے چٹائی پر دراز ہوتے ہوئے کمرے کا ایک نظر میں جائزہ لیا۔ ”بیار کمرہ تو یہاں نہیں ہے۔“ میں نے پہلی مرتبہ افضل کا مٹکا نادیکھا تھا۔

”یہ ایک کمرا چھارہ گیا ہے، باقی پوری عمارت خراب ہو چکی ہے بلکہ پورا محلہ جب میں یہاں آیا تھا تو گلیاں صاف شفاف تھیں اور مکان اُجلے اُجلے تھے۔ اب گلیاں گندی ہیں اور مکان میلے ہیں۔“

”میرا خیال ہے، سلامت بولا۔“ مسلمان صفائی کا زیادہ محمل نہیں ہو سکتا۔“

”یہ عمارت اچھی ناصی بڑی ہے۔“ افضل بتانے لگا۔ ”پوری عمارت فرنشٹ بھی

اور سامان سے بھری ہوتی۔ چوپڑا نے سی سالاں پر قبضہ کر لیا۔ میرے لئے

دے کے سری کرشن کی یہ ایک سورتی چھوڑ دی۔“

”افضل! انہوں نے تم پر احسان کیا،“ زوار بولا۔

”اچھا ہے،“ افضل نے معصوبانہ حیرت سے زوار کو دیکھا۔

”فریض کا آخر تم کیا کہتے، جو اصلی چیز بھی وہ انہوں نے تمہارے لئے پھوڑ دی۔“
”بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ میرا بھی یہی خیال تھا، پارا پھر لوگ ہیں۔ انہوں نے اپنی چیز
میرے لئے پھوڑ دی۔ اس کی وجہ سے تو یہ کہہ اجلاء ہے ورنہ پوری عمارت میں ہموڑی
ہے۔“

میں چھاتی پر دراز کہا ہیں اُنٹ پٹ کر رہا تھا درافتال تو سور ہام پے، تو بہت بور
آدمی ہے۔“

”مہبیں۔“

”پھر کیا کر رہا تھا۔“

”مورتی سے کلام کر رہا تھا۔“

”مگر تم سونے آتے ہیں۔“ اجمل بولا۔

”دھست سوچ۔“

”کیوں؟“

”سوکر اُنھوں کے تو تم دیکھو گے کہ تم چوچے ہے بن چکے ہو۔“

”تو چیل کہتا ہے،“ زوارہ جو کہ پلنگ پر بیٹھ گیا تھا، اُنھوں کھدا ہوا ”چلو یار۔“
افتال کو ساتھ لے کر تم وہاں سے تکل کھڑے ہوتے۔

”یار وہ تم کہاں جا رہے ہیں؟“ بلی سڑک طے کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

”بہت سیے معنی سوال ہے“ زوارہ بولا۔ ”مست پوچھو کہ کہاں اور کیوں۔ اصل یات
ہے کہ تم چل رہے ہیں۔“

”چلو اپریل چلتے ہیں!“

امیریل، ہمارے رات کے سفر میں آخری پڑاؤ تھا۔ ابھی یہ شہر ان کنڈیشنگ سے
نا آشنا تھا۔ سو امیریل نے اپنے کشادہ صحن اور اپنے اندر فلور سے بہت فائدہ اٹھایا۔

زنگین مزاج جوڑے سے گرمی کی راتوں میں ناروں بھر سے آسمان تلے شانستگی اور رکھ رکھاؤ سے
ہا محفول میں ہاختہ تھامے رفض کرتے رہتے۔ یہ رکھ رکھاؤ اس وقت خطرے میں پڑھ تا جب
رات بھیگتی اور سچلی کے سیے چراغ یکا یک گل ہو جاتے اور مس ڈولی کی آمد کا اعلان
ہوتا۔ پھر ہر سمت اندر ہیرتا۔ بس ایک مس ڈولی کے ارد گرد روشنی ہوتی بلکہ مس ڈولی
تو خود اپنے بیرتے نام لباس کے ساتھ اس اندر ہیرے میں ایک کونڈتی ہوئی۔ بچلی لگتی تھی۔ مان
اس روشنی کے دائرے سے میں مس ڈولی کے سوا بھی ایک مخلوق کبھی کبھی نظر آتی تھی۔ ایک
صلدی بیلی بلکہ کوتی دیٹریٹری سے تیچھے تیچھے آتا اور صندلی بیلی کو کبھی اٹھا کر، کبھی بھاکر
سے جاتا۔

یہ صندلی بیلی بیختر کی چیتی تھی، مستقل اس کی کرسی کے نیچے دیکی بیٹھی رہتی۔ جو اس
میز سے مل جاتا اس پر قناعت کرتی۔ کبھی آس پاس کی کرسی دوسرا میز کے قرب نہ لاتی
ہیں دیکھی لگتی۔ مان کیسرے کے وقت وہ انگڑاتی لے کر اٹھتی اور قلوپ پر پسخ جاتی، کبھی کبھی
بالکل مس ڈولی کے قریب۔ کوتی بیرا سے وہاں سے چمکا کر واپس لاتا اور وہ بغیر مدد کئے
واپس آ جاتی اور پھر بیختر کی کرسی سے لگ کر یا اس کے نیچے دیک کر بیٹھ جاتی ڈلوں اور
صلدی امپیریل کے دو مرکوزی کردار تھے۔

شیراز، کی وہ شام میرے حافظے میں سب شاموں سے الگ محفوظ تھے۔ جب
دشیراز، بھرا ہوا ہونے کے باوجود خاموش تھا اور یہ بیچ میں ایک تختی نصب تھی۔
”برائے ہر بانی سیاسی گفتگو سے پر بیز کجھے۔“ کل شام تک شیراز پر شور تھا کہ ہر میز پر اور
ہر ٹولی کے بیچ ایک ہی ہو صنوع تھا۔ آنے والے انتخابات۔ بحث کرنے والے کس نور
شور سے سکندر مرزا کے زوال کی پیشگوئیاں کرتے تھے مگر آج وہ پوری بحث موقوف

مخفی بہاں بیٹھتے ہوتے لوگ صرف چاتے پی رہے تھے۔ پسچ بچ میں کوئی بات، گمہ سرگوشی میں۔

« یار چالے ھٹنڈی تھی، زوار نے پیالی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

« ہاں بار امزہ نہیں آیا، اور منکا نہیں، یہ کتنے کتنے سلامت نے آواز دی۔ « عیدل۔»

چلتے پھر آئی اور گدم آئی، مگر مرنہ تو پھر بھی نہیں آیا۔ اس مرتبہ عرفان نے بدمزگی کا اعلان کیا، یار شیراز کی چاتے کو کیا ہو گیا۔

رنثہ رفتہ سب دوستوں کو یہ احساس سنا نے لگا کہ شیراز کی چاتے کو کچھ ہو گیا ہے۔ پھر اس احساس سے گزرے اور سوچنے لگے کہ شیراز کو کچھ ہو گیا ہے۔

« یار شیراز ویران ہو گیا۔»

« ہاں یار، پہلے یہاں کتنا ہے کہا جائے۔»

« لوگ کہاں چلے گئے؟»

« سب لوگ ہماری طرح فالتو تو نہیں ہیں۔»

سلامت نے زوار کو گھوڑ کر دیکھا، کیا مطلب؟»

« بات یہ ہے، زوار بولا۔»، تم شیراز میں بہت وقت ضائع

کرتے ہیں؟»

« پھر کہاں ضائع کریں، افضل نے بھجتے پوچھا۔

« ضائع کرنا ضروری ہے؟»

افضل نے زوار کو عصیل نظروں سے دیکھا، « چوہہے! وقت کو سنھاں کر نہیں رکھا جا سکت، وقت بھر حال ضائع ہوتا ہے۔»

اصل میں اب ہم شیراز، میں اُھٹرے سے اُھٹرے رہنے لگے تھے جسے رہنے کی، ہم نے کوشش تو بہت کی۔ سارے قصوں کو بھول کر ادب پر بحث کرتے کبھی نئے ادب پر، کبھی تحریری آرٹ پر، مگر جانے کیسے کوئی یا میں کرتے کرتے ہستا اور منوعہ علاتے میں جانکلتا۔ بات ادب سے ہٹ کر حالات پر ہونے لگتی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں کوئی برا برسکی میز کی طرف دیکھ کر چونکتا اور چب ہو جاتا۔ برا برسکی میز پر بیٹھے ہوتے کی نظر بن دوسری طرف، کان ہماری طرف۔ لگتا کہ جیسے کان ہمارے پیچوں تیچ رکھے ہوں، کان ہمارے تصور میں پڑتے ہو تے چلے جاتے، ہمارے ہونٹوں سے آگئے، ہم چپ ہو جاتے۔

آخر، ہم شیراز سے اُھٹر گئے تا اور لیسے اُھٹرے کے منڈلی تتریت ہو گئی۔ بس میں اور عرفان رہ گئے کہ اب شیراز سے بھرت کر کے اپریل میں جا بیٹھتے تھے۔ مگر اپریل میں بھی یہیں اب اتنا آباد نظر نہیں آتا تھا۔ نہ گورے پھرے، تاہم رقصوں کے جوان جوڑے، شپیا لیوں اور ہلیٹوں کی کھنکھٹا ہٹ، نہ یروں کی لیک بچپک۔ زیادہ مینڈب خالی پڑتی رہتیں۔ اکا دکا میز بھری ہوتی۔ کھلے صحن میں قلعہ پر کچھ ادھیر عمر ایکلو پاکستانی ہوڑے تھکے تھکے انداز میں رقص کرتے ہوتے۔ یہی تو کچھ تھکے ہوتے انداز ہی میں بھتا تھا۔ صندلی بیلی میخچر کی کرسی سے گلی آنکھیں موندے سے بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھار اٹھ کر فلور پر جاتی اور مسکین سی آواز میں میا وں کہتی اور خود ہی پلٹ آتی۔ فلور پر بھٹک کر کیا کہتی۔ اب یہاں مس ڈولی کا کیرے نہیں ہوتا تھا۔ اسے کوئی زندہ ول اڑا کر لے گیا۔ اس کے ساتھ اپریل کی رونق بھی رخصت ہو گئی۔

”کل سے میں نہیں آؤں گا۔“

”کیوں؟“

”مجھے اخبار میں نوکری مل گئی ہے اور رات کی ڈیوبٹی لگی ہے۔“

”میں نے عرفان کو تھب سے دیکھا“ تم نوکری کرو گے؟“

”کہنی پڑے گی۔“ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

”اچھا تو تم کل ادھر نہیں آؤ گے۔“ میں سوچ میں پڑ گیا ”پھر میں الیلا بیہاں آکے کیا کروں گا۔“

تینم! وہ تو مجھے بس چھو کر نکل گئی بتاریخ میں ایم۔ اسے کی تیاری کر رہی تھی۔ سفارش لے کر میرے پاس آتی اور تیاری میں میری مدد چاہی۔ ہاتھ اعد گی سے آتی، بڑے خلوص سے کتاب کھول کر بیٹھی، نوش لیتی اور چلی جاتی۔ ادھر ادھر کی مجال ہے کوئی بات کہ جائے۔ مجھے بھی اس سے کوئی اور بات کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ بہت سے ہنگ لڑکی نظر آتی تھی۔ کیا بات کہنا! اس سے مگر اس روز وہ مجھے اپھی لگی۔ وہ صحیح کا وقت تھا، میں بھی نہادھو کے پکڑے پہل کر نکلا تھا، وہ بھی ابھی اجنبی نظر آرہی تھی۔ اس بھری بس میں خواتین کی نشستوں کے درمیان کھڑے ہونے کی جگہ بیانے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ میرے آگے کھڑی ہے اتنی قریب کہ اس کی گوری کہ دن اور کافنوں کی سرخی مائل دیوبیں میرے سانس کی زد میں تھیں۔ میرا سانس بھی تو اس وقت کچھ تیز ہو گیا تھا۔

اہ کے بس سے اُتنے کے ساتھ میں بھی بس سے اُتر گیا۔ جمیع کو چیز کر اُترتے ہوئے مجھے تھوڑا وقت لگا۔ بس اسی تھوڑے وقت میں وہ نظر وہی سے اُو بھل ہو گئی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں نے سوچا، شام کو وہ پڑھنے کے لئے آئے گی، مگر وہ اس شام نہیں آتی۔ پھر کل شام سی، میں نے اپنے آپ کو تھیا۔ مگر وہ دوسرے دن بھی نہیں آتی۔ اس کے نہ آئنے نے میری بے تابی میں اور اضافہ کر دیا۔

اگلے دن میں نے اُسے فون کیا اور اُستاد کی حیثیت میں اس سے نہ آنے کا سبب پوچھا۔ اس نے کوئی بے معنی وجہ بتائی اور رکھنے کا کہ آج آؤں گی۔

شام کے انتظار میں وہ دن پھاڑ سا گز را۔ بیخ شام آئی اور وہ بھی آئی۔ آکر خاموش بیٹھ گئی۔ جس انہماں سے وہ سوال کرتی تھی اور نوٹس لیتی تھی وہ انہماں اس میں نظر نہیں آیا۔ آج میر بھی پڑھلتے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ جلدی ہی سبق پسیط دیا۔ پھر وہ بھی چپ میں بھی چپ۔

”تسینم!“ آخر میں نے زبان کھولی۔

جواب میں اس نے نظر پر اٹھا کر مجھے دیکھا، لگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں نے کیا کہنے کے لئے اسے مناظر کیا ہے۔ میں کھوسا لیا گیسے میں ہوں، ہی نہیں۔

آخر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے نہ کہ اسے پھوڑتے چلا۔ کمرے سے نکلتے نکلتے آہستہ سے کہا:

”تسینم!“

وہ مشہد گئی اور میں گم سرم۔ پھر وہ اچانک بھلی کی سی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

پھر وہ نہیں آئی۔

تینم جا چکی ہے۔ شام کی مصوفیت تختم۔ میں اندر سے خالی خالی، باہر سے بیزاد اشر میں بھکتا پھرتا ہوں۔ بلا وجہ قدم شیراز کی طرف اٹھ جاتے ہیں۔ عبدال جیران ہوتا ہے۔

مدعا کر صاب! آپ کہاں تھے؟“

”یہیں تھا؛ دوسرے کہاں ہیں؟“

”کوئی نہیں آتا تجی۔ چاہئے لا اقی؟“

”لے آؤز!“

میں ایک گونئے میں آکیلا بیٹھا پا تھے پی رہا ہوں۔ اردوگر و سب چور سے نئے اور اچھتی ہیں، اچھا یہ سفید سر والا آدمی اب بھی برا بر آتا ہے۔ بہت وضندر آدمی ہے، مگر بیار کہاں ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے۔ تیرانہ میں ایک وقت میں ہم، ہمی ہم تھے۔ اب ایسے صاف ہوتے ہیں جیسے بیہاں کبھی تھے ہی نہیں۔

فضل اچانک داخل ہوتا ہے؟ بیار سب لوگ کہاں ہیں؟ میں تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈٹ کے سرگیا۔ کوئی پھر ہنپیں ملا۔ میں نے سُنا تھا کہ تم اور عفان اپریل میں بیٹھتے ہو۔“
”بیٹھتے تھے۔“

”بہر حال میں اسی گمان میں وہاں گیا تھا کہ تم اب بھی وہاں بیٹھتے ہو۔ بیار وہاں کا لقش تو بہت ایتر ہے۔ کیبھی ہو رہا تھا، لاست گل بھتی۔ خیر میں بیٹھ گیا۔ دل میں کہا کہ روشنی آ جاتے تو میں ان چوڑیوں کو ڈھونڈ لوں گا۔ فلور کی طرف دیکھتا ہوں تو مس ڈولی غائب۔ ایک کمرہ وہ عورت ناچ رہی تھی۔ جاد دینے والے بھی اپنی آوازوں سے ایسے ہی لگے۔ روشنی آئی اور میں نے اردوگر دیکھا تو سب ما جھے گائے۔ میں نے تم دونوں کو ایک گالی دی اور ہاہر نکل آیا۔“

فضل پیچ کر رہا تھا۔ اپریل کا نیارنگ بھی ایک شام وہاں جانکلا تھا۔ پر نقشہ دیکھ کر واپس ہو لیا۔

”بیار! اپچھے لوگ کہاں چلے گئے؟“ یہ کتنے کتنے فضل نے چاروں طرف دیکھا۔ پر طریقہ ”بیہ کون لوگ ہیں؟ پیلک کہاں گئی؟“

”ذوار تو سی۔ ایس۔ پری بن کر شہر سے چلا گیا۔“

”اسے دفعہ کرو۔ دوسروں کی سناو۔“

”سلامت شاید امریکہ چلا جائے۔ سکا لرشپ کے لئے دوڑ دھوپ کہہ رہا ہے۔“

”العموم یو۔ ایس۔ آئی۔ ایس میں پایا جاتا ہے۔ اجمل بنیادی ہموروں میں کھپ گیا۔“

”اور عرفان؟“

”اُس سے اخبار میں توکہی مل گئی۔“

”چوہے!“ افضل پڑپڑا یا۔

”تو کیا کمرہ ہے؟“

”ر عشق ر۔“

”ر عشق؟“ افضل نے سر سے پرستک مجھے قادر شناس نظروں سے دیکھا۔

”یس تو ایک اچھا آدمی ہے۔“

”شیراز میں پیٹھ کر ادب اور آرٹ اور سیاست بکھارنا ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔“

افضل نے سنجیدگی سے میری بات سئی ”ر تو عجیب“ کہتا ہے۔ عشق ان کاموں سے

بڑا کام ہے۔ مگر کاسکے عشق کرنے کے لئے آدمی کو طبیب ہونا چاہیتے۔“

”یا را تم تو طبیب ہو۔“

”ہاں میں طبیب تو ہوں مگر یا زمین مصروف بہت ہوں۔“

”مصروف؟“

”کا کے اتحدے پتہ نہیں، چڑبوں اور پیڑوں کی شگفت میں میرا لکناؤ قوت گزرتا ہے۔“

عشق کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ توکہ، میں تیرے لئے دعا کروں گا۔“

”یا را اب دعا میرے کیا کام آتے گی؟ وہ تو اکرہ چلی گئی۔“ میں نے لمبا سا ٹھنڈا

سالس لیا۔

افضل نے بہت درمندری سے مجھے دیکھا اور نسیحت کے لمحے میں بولا:

”در کا کے ا دروازہ کھلا رکھ اور جا گزارہ۔“

دروازہ بومدت سے بند پڑا تھا، اسے وہ جاتے جلتے کھول گئی تھی۔ میں اسے

ایسے بند نہیں کر سکتا تھا۔ دروازہ کھلا رہا اور میں انتظار کرتا رہا۔ وہ نہیں آئی، کوئی

اور ہی آگئی۔ انیسے سے میری مدد بھیڑ موسیفی کا فرقہ میں ہوئی میں اسے دیکھ کے
جیران رہ گیا۔ اسے تم اکب آئیں تم لندن سے ہے،

ویسے اصل بات یہ ہے کہ میں اس کے اپانک لندن سے آجائے پر جیران نہیں ہوا تھا
جیران اس پر ہوا تھا کہ وہ ایک نئی پیشی کے ساتھ واپس آئی تھی۔ جب اپنے بیل میں میں نے
اسے دیکھا تھا، اس وقت تو میں اس سے بالکل متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے ہتھوارا قدم پڑھایا
بھی تھا۔ مگر میں نے اسے بالکل رستہ نہیں دیا۔ ایکسے دیتا۔ میرے اندر دروازہ ہی بند
پڑا تھا۔ بیوں بھی اس وقت وہ ایسی کام کی جاذب نظر تھی۔ جسم بالکل سپاٹ لگتا تھا۔
مگر اب تو اس کے جسم میں زاویتے خوب اچھار آتے تھے اور گولائیاں خوب نمایاں ہو گئی
تھیں۔ یہ ہنہ بھرے بھرے ہازو، کمراور کوٹھے کاخو شکو ارشیب و فرانا ہری بھری
گات، امنڈتا چھلکتا سینہ میں نے جیرت اور مست سے اس کے سراپا پر نظر ڈالی
«انیسے لندن نے تو تمہاری کا یا کلپ کر ڈالی ہے۔»

اس نے اس فقرے کو داد کے طور پر قبول کیا۔ ہنسی، پھر لوٹی:
«یہت رات ہو گئی۔ یہ خغل کب ختم ہو گی؟»

«ختم کا انتظار ضروری ہے؟
کوئی ضروری نہیں ہے۔»

، تم دونوں فوراً ہی یا ہر نکل آئے۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو اس نے
جیران ہو کر مجھے دیکھا۔ «اسے! تم موڑ دا لئے ہو گئے ہو۔ یعنی میں ہی نہیں بدلتی، تم
بھی بدلتے ہو۔»
«سینکڑ مینڈ نیاد روان چلتی ہے۔» اور کھلکھلا کر مہنس پڑی۔

«کہیں چل کر چاہتے نہ پہنیں۔»

« ضرور، ہم دہاں سے نکل کے کس لئے ہیں۔ اپیزیل کیسار ہے گا۔ مجھے لندن میں ایک ہی پیٹریہ مہان کی یاد آتی تھی۔ اپیزیل،»

« اپیزیل بھی یہی یہی گیا ہے۔ مگر وہ دوسرے رنگ سے بدلا ہے۔ اب تم اسے دیکھو گی تو تمہیں افسوس ہو گا۔»

« پھر تو مجھے ضرور چل کے دیکھنا چاہئے۔»

میں نے گاڑی اپیزیل کی طرف موڑ دی۔

اب اپیزیل کا رنگ دگر تھا۔ تکیرے، نہیں بیٹھا۔ میزہاں زیادہ خالی تھیں۔ جہاں نہاں اکاؤنٹ کا دمی بیٹھا۔ خاموش چائے ہی رہا تھا۔ صندلی بیٹھنے کی کہہ سی سے لگی آنکھیں موند سے پڑتی تھیں۔ پھر ایک لکساہیٹ کے ساتھ اٹھی۔ انگڑا اتنی لے کر بدن کو سیدھا کیا۔ پھر تھکی چال کے ساتھ مختلف خالی میزوں کے تیچھے سے نکلتی ہوئی، شامی کباب، کھلتے ایک کھڑکے قریب جا کر تھکی ہسکین آوازیں میا توں کیا، مگرہ اس کی بیس اعتمانی دیکھ کر آگے بڑھ گئی۔ میلے گرد آودھلور پہنچ کر شیخوں بیچ بیٹھ کر آنکھیں موند لیں۔

انیس نے افسوس کے ساتھ یہ سارا منتظر دیکھا۔ بولی:

« اپیزیل پر تو بالکل زوال آگیا۔ کیسے ہوا یہ؟ میں جب گئی ہوں اس وقت تو اپیزیل بہت عروج پہنچا۔ اس وقت کون یہ سور کر سکتا تھا کہ اس کا یہ عالم ہو جائے گا؟»

« عروج کی یہی تو خرابی ہے۔ اس عالم میں یہ لگان بھی نہیں گزرتا کہ اس عروج کو زوال بھی ہو سکتا ہے! اور جب زوال شروع ہوتا ہے تو اسے یقین میں روکا نہیں جا سکتا۔ زوال اپنی انہماں ک پہنچ کر دم لیتا ہے۔»

« یہ تو تم قوموں کے زوال کی بات کرنے لگے ہو۔ میں اپیزیل کی بات کر رہی تھی۔»

« زوال جس پر بھی آتے، جہاں بھی آتے، ایک ہی طرح اُس کا عمل ہوتا ہے۔»

ایسے نے مجھے معنی خیز انداز میں دیکھا "تم اس عرصے میں لگتا ہے کہ پورے دانشور
بن چکے ہو پاؤ یہاں سے چلتے ہیں۔"

گاڑی میں بیٹھ کر میں نے تجویز پیش کی:

"اس وقت لوہین کھلا ہو گا۔ وہاں چلتے اچھی ملے گی۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

لوہین میں بیٹھ کر وہ نظر انہ سے بولی:

"تو میں لندن یا کمر بدل کئی ہوں؟"

میں نے پھر سر سے پیٹک اسے دیکھا اور سرو رہوا ہوا کل بدل کئی ہو۔"

"مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ تم یہیں بیٹھے بیٹھے بدل کئے ہو۔"

"کیسے؟"

"ایسے کہ اب تم لڑکی سے باتیں کر سکتے ہو اور رات دنگے ہو تو میں اس کے ساتھ چلتے
پائی سکتے ہو۔" لک، بولی:

"تم نے میرے پیٹھے کوئی بخت کا تجربہ تو نہیں کر ڈالا ہے۔"

"کیا تو نہیں، کہنا پاہتا ہوں۔"

"یکورٹ مت بولو۔ HUMA RABBEY BEHAVIOR" بتارہ ہے کہ تم نے بہ تجربہ کر ڈالا ہے۔

نامام ہو گئے تو الگ بات ہے۔ بخوبہ کوئی ایسی بات نہیں۔ پہلے تجربے میں ایسا ہی ہوتا
ہے۔ دوسرا تجربہ کرو، کامیابی تمارے قدم پوچھے گی۔"

"میں OVERAGE نہیں ہو گیا ہوں؟"

"نان سٹس اڈھ تو عشق و بخت کا اصلی پیر پڑھ چالیں کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔

اور جس مرد کے کپٹی کے بال سفید ہوں، اس پر تو لڑکیاں بھیسوں کی طرح گرتی ہیں۔"

میں نے غیر ارادی طور پر اپنی کپٹی کے بالوں پر انگلیاں پھیرسیں۔ یہ فیشن یہاں کب پہنچ گا؟"

”پہنچ چکا ہے۔ تم میدان میں اڑو۔ بس جلدی سے کسی لڑکی کے ساتھ سلسلہ شروع کر دو۔
تباہ کس کے ساتھ شروع کرنا چاہتے ہو؟“

”تمہارے ہی ساتھ شروع ہو رہا تھے تو کیا مضافاً تقدیر ہے۔“

”میرے ساتھ با۔“ اس نے مجھے کسی قدر تعجب سے دیکھا اور پھر یہ پرواتی سے ہنسی ”تم
میں تو واقعی ہراثت آگئی ہے۔“

”بہر حال اس میں ہرج کیا ہے۔“

”ہرج تو کوئی نہیں ہے۔“ اس نے متانت سے کہا:

”مگر میں مشکل لڑکی ہوں۔ تم میرے ساتھ چل نہیں سکو گے یا سوچ کر بولی:
ورسنوا اگر تمہارا معاملہ رضیہ سے کرا دیا جاتے تو کیسی رہبہ ہے؟“
”مجھے وہ لڑکی پسند نہیں۔“

”پھر کون پسند ہے؟“

”تم۔“

”اچھا!“ مسلسل ای ”تم میں واقعی مردانہ جہالت آگئی ہے۔ اچھی بات ہے۔“
بوریں سے اس کے گھر جاتے ہوئے میں نے مزید مردانہ جہالت کا منظا ہو کیا گا ٹھی جلتے
چلاتے ایک ٹھنڈے دل سے ہٹایا اور اس کے بہمنہ پالو پر رکھ دیا۔ اس مردانہ جہالت پر اس نے
کوئی داد نہیں دی، حوصلہ شکنی بھی نہیں کی۔ بازو کو سہلانا ہوا میرا ہاتھ شلتے پر گیا۔ شلنے کا
سفر کرتا ہوا جب سینے کی طرف بڑھنے لگا تو اس کی طرف سے ہدایت یاری ہوتی ”اگر نہیں؟“
”رکیوں؟“

”ہربات پر پھنسنے کی نہیں ہوتی۔ بس میں نے تمہیں تباہیا ہے۔“

”مگر میرا جی چاہتا ہے۔“ یہ کہتے کہتے میں نے گاڑی کو رستے سے محفوظ اتار کر پریکٹ
دیتے۔ رات بہت جاچکی تھی اور سڑک اس کنارے سے اُس گزارنے نیک خالی پڑی تھی۔

میں انہیس کے قریب سرک آیا، اننا فریب کہ میں اپنے جنم سے اُس کے کوٹے کی نرمی اور گہمی کو خوب
کر سکتا تھا میں نے آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرے، کھڑی نر لفول کے ساتھ پھسلتی
پھسلتی انگلیاں نرم شانوں پر اُتھ آئیں، شانوں سے پھسلواں بازوؤں پر پھر میں نے آہستگی
اور نرمی سے اس امنڈتے سیتے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے متنانت سے نظریں اٹھایں مجھے دیکھا
”میں نے تم سے کیا کہا تھا؟“

میرا ہاتھ اس نرمی اور گہمی میں اسی طرح پیوست رہا۔ وہ مجھے دیکھے جا رہی تھیں حکم دے
دیا تھا، دیکھ رہی تھی کہ اس کی بیجا اوری کب ہوتی ہے۔ میں نے آہستہ سے ہاتھ ٹھیا لیا مگر ہم
ایک دوسرے کو اپنکے جار پے تھے۔ میں اس کے اور فریب سرک آیا۔ میرے ہونٹ اس کے
شاداب ہوٹلوں کی طرف بڑھنے لگے۔

قطعی لجھے میں کہا:

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”میں مشکل رڑکی ہوں۔ تم سیدھے آدمی ہو۔“

”میں اپنے سیدھا نہیں رہا ہوں۔“

”اچھا،“ اس نے مجھے نیکھی نظر وں سے دیکھا۔

”ہاں۔“

وہ ہنس پڑی جیسے نیچے کی کوئی معصوانہ سی بات سن کر ہنس پڑتے ہیں یا اچھا ہلو،
رات بہت ہو گئی ہے مجھے سونا بھی ہے۔“

گھر پر گاڑی سے اُترتے ہوئے یلوی:

”اوٹھیں کافی بلاتے ہیں۔“

”رات کے گھر والوں کو پریشان کرنا شرافت کی بات ہے۔“

» نہیں میرا کمرہ الگ تھلک ہے۔ کافی کا انتظام میں اپنے کرے، ہی میں رکھنی ہوں۔ «

» گمراں وقت، یہ کھڑاں تم کماں پھیلاؤ گی۔ میں تھیں پور کرنا نہیں چاہتا۔ «

مسکنے کہ بولی:

» اچھا، باقی باقی! «

» باقی باقی! میں نے کہا اور گاڑی شارٹ کی۔

دور تھل کرنے کے بعد میں مٹھکا۔ وہ مجھے کیوں روک رہی تھی؟ میں نے ہر یک لٹاٹے۔
بیچ سڑک پر گاڑی روک کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر میں نے تیزی سے گاڑی شارٹ کر کے
موڑی اور فرائٹے بھرتا ہوا اس کے گھر کی طرف چلا۔

گاڑی کو بھٹی کے احلٹے میں داخل کی۔ رکا، اس کمرے کا جائزہ لیا جو انہیں نے بتایا تھا
کہ یہ اس کامرہ ہے اور باقی کمروں سے الگ تھلک ہے اور یہ بھی تو تباہ تھا کہ میں رات کے
نیک جاگتی رہتی ہوں اور پڑھنی رہتی ہوں۔ گمراں وقت تو کمرہ انہیں میں ڈوبا ہوا تھا۔
روشنی کی کوتی شعاع کسی در پیکے کسی شیشے سے چھپتی نظر نہیں آئی بھی۔ میں نے ہست
لبے دلی سے گاڑی موڑی اور واپس ہو لیا۔

» اسے! میں پلتے چلتے مٹھکا۔ امیزیل کی عمارت گرمی پڑھنی پھر ادھی ریوالی بالکل

ڈھنے گئی تھی۔ فلور پہ منوں مٹی پڑھی تھی۔

کھڑا دیکھتا ہے۔ جانا آگے تھا لگہ پھر قدم آگے کی طرف اٹھے، ہی نہیں۔ میں سے پلٹ
لیا۔ پلٹتے پلٹتے نظر اچانک صندلی بی پہ جا پڑی۔ وہ منوں مٹی میں دبے فلور کے آس پاس اس
چھپٹے میں ساتے کی طرح چک رہی تھی۔ اب، وہ لکنی میلی اور در بی ہو گئی تھی۔

» پوچھو ا تم پھر رکھتے ہے؟ « افضل نے منڈلی جھی میکھی اور جیران ہوا۔

» ہم کے کماں تھے؟ « سلامت اور اجمل اکٹھے بولے۔

» سلامت! « افضل سلامت سے حناظیب، ہوا:

”تجھے امریکہ کا جو سکالر شپ مل رہا تھا، اس کا کیا ہوا؟ میں سمجھ رہا تھا کہ تو ای
تک امریکہ پہنچ چکا ہو گا؟“

”امریکہ“ سلامت نے خاتمت بھرسے الجھے میں کہا:
”تمہیں پتہ ہے کہ میں انٹی امریکن ہوں۔ سکالر شپ کی آخر، مونی بھی۔ لگرے
میں نے REJECT کر دی۔“

عرفان سلامت کو دیکھ کر خاموشی سے مسکرا یا۔

”چھے ہے! تو کیوں مہش رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ میں بالکل نہیں بولوں گا۔“ عرفان نے مسکرا ہٹ کو قابو میں کر کے سینہ
سی صورت بنالی۔ سلامت نے اسے عضے سے دیکھا مگر چپ رہا۔
”اورا جمل تو؟“

”میں؟“ اجل نے نہایت بسینگ سے اعلان کیا:

”اپوں امریت کے ساتھ یا RECONCILIATION نہیں کر سکتا تھا میں بالکل آباد“

”یا انکا ل دیا گیا؟“ افضل نے پھر منعی نیز نظروں سے عرفان کو دیکھا۔

”میں خاموش ہوں۔“ عرفان ایک حسین سی مسکرا ہٹ کے ساتھ بولا۔

عرفان بھی تو پھر ظیراں میں نظر آنے لگا تھا۔ دن دن بھر اور رات رات پھر خبار میں
سر کھپانے کے بعد اسے کام کو بنتا نہ کا اور دفتر سے تکل بجا گئے کے طریقے آگئے تھے۔
سب بار ایک ایک کر کے واپس آتے تک گئے ہوتے دن واپس نہیں آتے۔

شہرب ایک نئے نظر سے کے سحر میں تھا۔ پرانے لفڑوں کی گرفت ڈھیلی پڑا چکی تھی۔ اگرچہ انہیں ہوا دینے والے اشتہار اسی صورت لگے ہوتے تھے، اسی صورت میں سب گالیاں سب الذاام تھے اسیاں دیوار دیوار رقم تھیں کسی دھوپ، کسی یارش نے ان کا کچھ نہیں رکھا اُنھا پھر بھی سب کا نگ، سب کے لفظ ماند پڑا چکے تھے۔ اس نے دیواروں کو دیکھا اور تجھب کیا کہ نظر سے کتنی جلدی یا سی ہو جاتے ہیں۔ بنائیو آندھی دھاندی کیا اور دیواروں، کاروں، بلیک بورڈوں پر چھاتا چلا کر شانڈیا کر کش انڈیا۔ ٹھرٹھر ایک ہی چہرہ، محفل محفل ایک ہی لفٹلو، جنگ، جنگ، جنگ۔ ایک ہی سوال کہ گھر باہر ہر جگہ اس کا تعاقب کر رہا تھا؛ جنگ ہو گی یا نہیں، ہو گی۔

«مولانا صاحب! تمہارے کرامت، کاظم ایسا ہے۔ آج کل وہ ڈھاکہ میں لگا ہوا ہے، کیا لکھتا ہے، خیریت سے تو ہے نا؟»

«وہی سے تو خیریت ہی سے ہے، لگہ خط سے لگتا ہے کہ کچھ پر نیشان ہے۔»

«پر نیشان اس ننانے میں کون نہیں ہے۔»

«ماں یہ تو ہے، عالات، تو روز بروز خراب، ہی ہوتے پلے جا رہے ہیں۔،، خواجہ صاحب بہ کتنے لکھتے اس کی طرف مخاطب ہوتے۔

«کیوں ذاکر پڑے؟»

” جی ہاں حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔“

” خبریں کیا ہیں؟“

” خبریں؟ کوئی خاص خبر تو ہے نہیں۔“

” مولانا صاحب!“ خواجہ صاحب اباجان سے مخاطب ہوتے۔

” ہمارے بیٹوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اتنے گھوستے پھرتے ہیں، خرپوچھو تو کہتے ہیں کہ کوئی خبر نہیں۔ سلامت سے پوچھتا ہوں تو ایک ہی خبر سناتا ہے کہ انقلاب آ رہا ہے میں نے کماکہ پڑا! انقلاب نہیں آ رہا ہے، جنگ آ رہی ہے۔ بولا، یہ اسی کے ساتھ انقلاب آ کے گا میں نے کماکہ بد بختا، دیکھتا نہیں منشی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے کیا جواب دیتا ہے کہ منشی پاکستان آزاد ہو رہا ہے میں نے کماکہ سکل چاہرم دے پڑیں ہے گھر سے۔“

” اللہ ہم پر رحم کرے۔“ اباجان نے مخفراً کہا اور حقے کی نے منڈیں دیا۔

” ہاں اللہ رحم کرے، حالات خراب ہیں۔ آج صحیح ہی کی بات ہے، میں نہان پڑھ کے لوٹا تو دیکھا کہ فوجی کاڑیاں والگہ کی طرف جا رہی ہیں، بہت کاٹی بھتی۔“ رکے پھر اس سے مخاطب ہوتے۔

” پڑا کیا خیال ہے جنگ ہو گی یا نہیں ہو گی۔“

” آپ کا کیا خیال ہے۔“ اس نے ان کا سوال نہیں ہی لوٹا دیا۔

خواجہ صاحب نے اپنی طرف آتے سوال کو اباجان کی طرف دھیل دیا ” مولانا صاحب بیٹے کے سوال کا جواب دو۔“

ابا جان خاموش حق پیٹتے رہے۔ مگر خواجہ صاحب ان کی طرف تکے جا رہے تھے آخر انہوں نے نے سے منڈہ مٹایا، حق خواجہ صاحب کی طرف سر کایا اور اس سے مخاطب ہوئے۔

” بیٹے، سیاسی معاملات تو تم سمجھو، تم ایک بات جانتے ہیں اور تم سے کہتے ہیں کہ جب حاکم نظام ہو جائیں اور اولادیں سرکش ہو جائیں تو پھر علیٰ خدا پر کوئی

بھی آفت ٹوٹ سکتی ہے۔»

«جب حاکم ظالم ہو جائیں، وہ ٹھہر کا، جب حاکم ظالم ہو جائیں گے اور رعایا خاک چلتے گی۔

ابا جان کا کہا، ہوا بھولا نیسا فقرہ اس کے ذہن میں گوچ لیا۔

« بالکل ٹھیک ہے۔» خواجہ صاحب کا سرخیک گیا تھا۔

دونوں بزرگوں کو خاموش دیکھ کر اس نے موقعِ غیبت جانا اور وہاں سے سرک لیا۔

نفیر اکی دکان پر بھی ہی بڑکہ تھا۔ سگرہ بیٹ کی ٹوبیا سے پکڑ لئے پکڑ لئے سوال کہہ ڈالا

«ذاکرہ صاحب جی! آپ کا کیا خیال ہے جنگ ہوگی؟»

« تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟»

« پتہ نہیں جی، پر لوگ کہہ رہے ہیں۔»

کریم بخش نے جو کہ دکان کے منفصل رکھے ہوتے مونڈھے پر ٹولبا بیٹھا تھا اعتماد سے علان کیا

« جنگ تو جی ایس ہو سے ای ہو فتنے۔»

« کریم بخش! اونے پر کیسے جاندے؟»

« میں فخر کی نماز پڑھتا ہوں، تو پڑھتا ہے؟»

« نہیں۔»

« پڑھ، پھر پتہ چل جاوے گا۔ شام کو آسمان کا کچھ پتہ نہیں چلتا، اتنا شور ہوتا ہے۔ اس وقت تو وہ گورنگا ہوتا ہے۔ فجر کو اُنھے کے دکھیو، اس وقت آسمان پوتا ہے۔ آج کل تو دمدار

شارہ نکلا ہو ہے۔»

« یارستا ہے پر مجھے یقین نہیں آیا۔»

« فجر کو اُنھے اور آسمان کو دیکھ، یقین آ جاوے گا۔ دم بالکل جھاڑو کی طرح ہے۔»

« یار کہیں جھاڑو، ہی ن پھر جاوے۔»

شیراز میں اس نے ابھی قدم رکھا ہی نخادر عرفان میں، چو دہاں پہلے ہی سے بیٹھا

ہوا تھا۔ علیک سلیک کی ہی بھتی کہ سلامت اپنی پلٹن سمیت داخل ہوا۔ سلامت کے ساتھ اب صرف اجمل نہیں تھا بلکہ پورے ٹولی بھتی اور اب اپنی قائدانہ حیثیت کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ زیادہ **مٹھے سے** بات کرتا تھا۔

«راجحت پسند واب» سلامت نے پڑھا اسے، پھر عرفان کو گھور کے دیکھا «کیا خیال ہے تمہارا جنگ ہو گی یا نہیں ہو گی؟»

«کامش اچک بیرے خیال کے تابع ہوتی۔» عرفان کا لمحہ طنز یہ تھا۔

سلامت کا چہرہ فرد़ا ہی نئی گلگا «عرفان، اعتمار سے شالستہ مزارج اور لطیف طنز کا زمانہ گزر چکا ہے۔ یہ بورڑ وائی میکیار ہیں جو کنہ ہو چکے ہیں۔ آج نہیں سیدھا جواب دینا ہو گا کہ تم جنگ پاہتے ہو یا نہیں پاہتے۔» آج اس کو مت منٹ سے تم نہیں پسخ سکتے۔

«کومٹ متبا» عرفان نے نہر خذیلہ اور سلامت تمہرے غلط دروازے پر دشکھی ہے

میرا کو مت منٹ نہ جنگ کو روک سکتا ہے، نہ جنگ کو شروع کر سکتا ہے۔»

«وقت کے سوال سے پسخ نکلنے کی وہی فرسودہ زنگ آلو دبورڑ وائی میکینک،» سلامت نے عرفان کو حقارت سے دیکھا اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا «اور تم ذاکرہ؟ تم کیا کہتے ہو۔»

«میں ابیں کیا کوں گا؟»

«تم جنگ کے حق میں ہو یا جنگ کے خلاف ہو۔»

وہ سوچ میں پڑ گیا «پتہ نہیں یار، رُک کہ بولا۔» کچھ پستہ منٹیں چل رہا کہ آج میں کس چیز کے حق میں ہوں، اور کس چیز کے خلاف ہوں؟

اجل نے گھور کے اسے دیکھا ابیہ شخص، میں کنفیوور کرنا چاہتا ہے۔»

پلٹن میں سے دوسرا لولا «جب صورت حال کھسل کر، مامنہ آتی ہے اور کومٹ منٹ مالگتی ہے تو رجعت پسند یوکھلا جاتے ہیں۔»

سلامت نے آستین پر چھایاں غہیل نظر میں چاروں طرف ڈالیں وہ ایک بھرپور تقویٰ کے